حکمتِ سید مودودیؒ

(اسلامی تحریک کو زوال سے بچانے کے لیے دو امور)

از جناب سید اسعد گیلانی صاحب

دُنیا میں جب کوئی تحریک کسی اخلاقی یا اجتماعی یا سیاسی مقصد کو لے کر اُٹھتی ہے تو اُس کی طرف وہی لوگ رجوع کرتے ہیں جن کے ذہن کو اس تحریک کے مقاصد اور اس کے اُصول اپیل کرتے ہیں، جن کی طبیعتیں اس کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں، جن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہی تحریک صحیح اور معقول ہے، اور جو اپنے نفس کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کو چلانے اور دُنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سوا باقی تمام لوگ جن کی طبیعت کی افتاد اس تحریک کے مقاصد اور اُصولوں سے مختلف ہوتی ہے پہلے ہی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کے دائرے میں آنے والے لائے نہیں جاتے بلکہ خود آتے ہیں۔ انہیں کوئی چیز مجبور کر کے خواہ مخواہ اس میں داخل نہیں کر دیتی، نہ کوئی طاقت انہیں لا کر اس میں چھوڑ جاتی ہے، جیسے کوئی کسی اندھے کو جنگل میں لے جا کر چھوڑ دے اور اُسے کچھ پتہ نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے لایا گیا ہوں۔ بلکہ وہ اسے جانچ کر، پرکھ کر، سمجھ کر، پورے شعور اور کامل قصد کے ساتھ آتے ہیں، اور جب آ جاتے ہیں تو اس کے مقصد کو اپنا مقصد بنا کر کام کرتے ہیں۔ کیونکہ وہی مقصد ان کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اُصولوں کو وہ اپنے اُصول بنا کر چلتے ہیں۔ کیونکہ ان اُصولوں کو صحیح و برحق سمجھ کر ہی وہ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اس تحریک کو چلانا زندگی کا مشن بن جاتا ہے کیونکہ جو چیز ان سے ان کا پچھلا مسلک و مشرب چھڑاتی ہے اور ان کو اس نئے مسلک کی طرف کھینچ کر

لاتی ہے۔ وہ دراصل اُن کے قلب و رُوح کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہی مسلک حق اور راست ہے۔ دراصل اس تحریک میں ان پر حق منکشف ہوتا ہے۔ اس کا انکشاف ہی ان کو اس تحریک کی طرف کھینچتا ہے۔ اور انکشافِ حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو کبھی اس مقام پر نہیں ٹھہرنے دیتا جہاں وہ انکشاف سے پہلے تھا، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اُس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اُسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اُسے قبول کرتے ہیں ان کی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاسکتی۔ وہ اپنے اُصول کی خاطر دوستیوں اور خونی و قلبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن، اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں۔ ان کے خصائل میں تغیر آجاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی شکل، صورت، لباس، خوراک اور عام طرزِ زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ گرد و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہزاروں سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جارہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتدا یوں ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی ہے جو اسے چلانے کے لیے اُٹھتی ہے۔ اس کے مقاصد اور اس کے اُصول خود ہی آدمیوں کی اس بھیڑ میں سے جو دُنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوتی ہے، اپنے مطلب کے آدمی چھانٹتے ہیں اور صرف انھی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے ہیں جنھیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں، ان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد بھی اسی مسلک پر اُٹھے، جس کو خود انھوں نے حق پاکر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم، تربیت، گھر کی زندگی اور باہر کے ماحول سے اس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے خیالات، اخلاق، عادات اور خصائل سب کے سب اس مسلک کی رُوح اور اس کے اُصولوں کے مطابق ڈھل جائیں۔ اس میں انھیں ایک حد تک

کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک حد تک ہی ہوتی ہے۔ پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی کے ماحول اور خاندانی روایات کو طبائع کے ڈھالنے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے مگر فطرت، دماغ کی ساخت، مزاج کی پیدائشی افتاد بھی ایک اہم چیز ہے، اور حقیقت میں دیکھا جائے تو بنیادی چیز یہی ہے۔ فطری طور پر دنیا میں ہر قسم کے آدمی، ہر مزاج، ہر رجحان، ہر ساخت کے آدمی ہمیشہ سے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح اس تحریک کے ظہور کے وقت ہر طرح کے آدمی دنیا میں موجود تھے اور ان سب نے اس کو قبول نہیں کر لیا تھا۔ بلکہ صرف وہی اس کی طرف کھنچے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اسی طرح بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے پیدا ہوں گے انہیں لامحالہ اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ ان میں ابوجہل اور ابولہب بھی ہوں گے۔ عمرؓ اور خالدؓ بھی ہوں گے۔ جس طرح آذر کے گھر میں ابراہیم حنیف پیدا ہو سکتا ہے، اسی طرح نوحؑ کے گھر میں "عمل غیر صالح" بھی پیدا ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق یہ امر لازمی ہے کہ اس سوسائٹی سے باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی افتاد اور اپنی طبیعت کے رجحان کے لحاظ سے اس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور خود اس کے اندر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اس کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت کا وہ نظام جو تحریک کے ابتدائی حامی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ ان کی پوری پود کو ان کے مسلک کا حقیقی متبع بنا دے۔

اس خطرے کے سدباب اور تحریک کو اس کے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود ناکارہ نکلیں، ان کو جماعت سے خارج کر دیا جائے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعے سے جماعت میں ان نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو رجحان و ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جن کو اس

کے اُصول و مقاصد اسی طرح اپیل کریں جس طرح ابتدائی پیروؤں کو انہوں نے اپیل کیا تھا۔ یہ اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ ان دونوں تدبیروں کی اہمیت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام تر نسلی افزائش ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے، اور جو لوگ اس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ناکارہ لوگوں کو خارج کرنے میں بھی خونی رشتوں اور معاشرتی تعلقات اور دُنیوی مصلحتوں کی خاطر تساہل برتا جاتا ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائشیں نکالی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کو اتنا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سرے سے اس کے سرحدی نشانات اور امتیازی حدود باقی ہی نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ بھانت بھانت کے آدمی جماعت کے دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں، جن کو کسی قسم کی مناسبت اس کے مسلک سے، اس کے اُصولوں سے اور اس کے مقاصد سے نہیں ہوتی۔

پھر جب جماعت میں اس کے اُصولوں سے حقیقی مناسبت رکھنے والے کم اور مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اجتماعی ماحول اور تعلیم و تربیت کا نظام بھی بگڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل پہلے کی نسل سے بدتر اُٹھتی ہے۔ جماعت کا قدم روز بروز تنزل و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس مقصد کا اور ان اصول و مقاصد کا تصور بالکل ہی ناپید ہو جاتا ہے، جن پر ابتدا میں وہ جماعت بنی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر حقیقت میں جماعت ختم ہو جاتی ہے۔ اور محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ نام جو ابتدا میں ایک تحریک کے علم برداروں کے لیے بولا جاتا تھا، اس کو وہ لوگ استعمال کرنے لگتے ہیں جو اس تحریک کو مٹانے والے اور اس کے جھنڈے کو سرنگوں کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ نام جو ایک مقصد اور ایک اُصول کے ساتھ وابستہ تھا، وہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگتا ہے بلالحاظ اس کے کہ صاحبزادے کی زندگی کے اُصول اور مقاصد اس نام سے کوئی مناسبت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ کر وہ

نام اپنی معنویت کھو دیتا ہے ۔ وہ خود بھول جاتے ہیں اور دُنیا بھی بھول جاتی ہے کہ یہ نام کسی مقصد کسی مسلک ، کسی اُصول کے ساتھ وابستہ ہے ، بے معنی و مفہوم نہیں ہے ۔

اِسلام اس وقت اسی آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے ۔ مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے اور اس کے طرزِ عمل نے دُنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دُنیا میں ایک مقصد اور کچھ اُصول لے کر اُٹھی تھی ، اور مسلمان کا نام اس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے لیے بنائی گئی تھی ۔ تحریک گم ہو گئی ۔ اس کا مقصد فراموش کر دیا گیا ۔ اس کے اُصولوں کو ایک ایک کر کے توڑا گیا ۔ اور اس کے نام اپنی تمام معنویت کو کھو دینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے ۔ حد یہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے ، جہاں اس کے اُصول توڑے جاتے ہیں ، جہاں اسلام کے بجائے غیر اسلام ہوتا ہے ۔ میرے دل نے بارہا یہ سوال کیا ہے کہ اسلام جو کبھی آندھی اور طوفان کی طرح اُٹھا تھا جس کے سامنے دُنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھہر سکتی تھی ۔ آج اس کی کشور کشائی اور عالمگیری آخر کس چیز نے چھین لی ؟ اس کا جواب ہر بار مجھے یہی ملا کہ اسلامی تحریک پر تنزل و انحطاط کے اسی فطری قانون کا عمل جاری ہوا ہے ، جسے میں نے بیان کیا ہے ۔ اب اصلاح کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو از سرِ نو ایک تحریک کی حیثیت سے اُٹھایا جائے اور مسلم کے معنی کو پھر سے تازہ کیا جائے ۔ مُردوں کی اس بستی میں جو تھوڑے بہت مسلمان دل ابھی حرکت کر رہے ہیں ، اور جن کی گہرائیوں سے ابھی تک یہ شہادت بلند ہو رہی ہے کہ اسلام ہی حق اور صدق ہے اور انسانیت کی فلاح صرف طریقِ اسلامی ہی میں ہے ، ان کو جان لینا چاہیے کہ اب کرنے کا کام صرف یہی ہے —— مگر اس کام کو کرنا کھیل نہیں ہے ۔ یہ وہ کوہ کنی ہے جس کے تصور ہی سے فرہاد کا زہرہ آب ہو جاتا ہے ۔